ڈاکٹر مہرونہ لغاری
پرنسپل گونمنٹ گریجویٹ کالج ویمن، سٹی ڈیرہ غازی خان

اکیسویں صدی میں درپیش چیلنجز، بدلتے رجحانات اور اردو ناول

Dr. Mehroona Leghari
Principal, Government Graduate College, Women City D.G Khan.

Twenty First Century's Challenges, Changing Trends and Urdu Novel: A Critical Analysis

The recent pandemic has not only formally announced the entry of man into the 21st century but also indicate the upcoming challenges for humanbeing. The individual of this Century suffers from duality/binary opposition where he is in an isolation/alone but not in the previous sense as he is at the same time sitting in middle of the whole world. This Mob, not his family, but the whole world has gathered at his fingertips, Man has begun to travel for centuries in minutes and seconds.Youval Noh Hariri a Nobel Prize winner philosopher of new era says man has been hacked by his own discovered biotechnology and information technology. This InfoTech or biotech data has snatched man s free will. This algorithm now replace the ancient times place of philosophers, thinkers, saints, sages, writers and leads/compels man to choices of corporate world. Now the corporate world better known mans choices by this algorithm but the man himself notter. The Challenges of self identity is the most important question of this century. The trend of predicting the future is growing day by day. Now a strange situation is knocking on human beings doors. Nature is disappearing. It is impossible to escape from artificial intelligence. Every second changing of technology results in rapid change of life and social taboos.

Keywords: *Modern Trends, Crises of self identity, Changing World, Religion, Culture, Politics, Social Values.*

اکیسویں صدی کی تیز رفتاری کی زد میں عالمی سطح پر تمام معاشرے، عالمی اقتصادیات اور عالمی سیاست ہیں تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ دنیا پہلی بار ایک بکھراؤ یا انتشار کی بجائے ایک کل اکائی میں سموئی جاتی ہے کہ

جو کبھی ماضی قریب بالخصوص گزشتہ صدی کی آخری دہائی میں نہ تھی۔ اکیسویں صدی واضح طور پر انسان کے ٹیکنالوجی میں داخلے کی صدی کے ساتھ دنیا کی قلب ماہیت کی صدی ہے۔ لیکن یہ بہر حال ابھی بھی ناتمام تبدیلیاں ہیں مستقبل بینی کے ماہرین کے نزدیک اگلے ایک عشرے میں آنے والی تبدیلیاں موجودہ آج کا عشر عشیر بھی نہیں ہیں۔ اس صورت میں اس موضوع کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ عالمی سطح پر جہاں اس بات میں ماہرین کے یہاں ہی نہیں بلکہ عوام الناس میں بھی یہ شعور اور دلچسپی پیدا ہو رہی ہے کہ آنے والے کل کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ آیا ہمارا آج کیا ہماری نسل کے رہتے یونہی رہے گا؟ یا بدلاؤ کا سامنا رہے گا؟ مستقبل قریب پر مبنی یہ سوالات انسانی ذہن کو مضطرب رکھتے ہیں۔ حالیہ وبانے اکیسویں صدی میں انسان کے داخلے کی باضابطہ تصدیق کر دی ہے۔ ایک ایسی صدی جس کا فرد ایک ایسی شنویت کا شکار ہیں جہاں وہ اکیلا بھی ہجوم میں گھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ہجوم اس کے گھر کے افراد کا نہیں بلکہ پوری عالمی دنیا اس کی انگلیوں کی پوروں میں سمٹ آئی ہے۔ انسان نے صدیوں کا سفر منٹوں سیکنڈوں میں کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس صدی کا ایک فلاسفر نووال نوح ہراری کے نزدیک انسان اپنی ہی دریافت کر حیاتیاتی خواہشات کے اسرار رموز تک رسائی [دہ بائیو ٹیکنالوجی] اور شماریاتی حساب کتاب کے چکر پھر [انفارمیشن ٹیکنالوجی] کے ہاتھوں ہیک ہو چکا ہے۔ آج کی کارپوریٹ دنیا اسشماریاتی حساب کتاب کی طاقت [الگورردم] سے یہ جانتی ہے کہ اہم کیا ہے خواہ وہ صارف ہو، ووٹر ہو، طالبعلم ہو، قاری ہو، غرض فرد واحد کس وقت کیا محسوس کرے گا؟ کیا رد عمل کرے گا؟ یہ سب ڈیٹا یا مواد اس کے پاس موجود ہے اور وہ اس کے استعمال سے کماحقہ واقف بھی ہے۔ لہذا انسان جو گذشتہ صدیوں میں وبا قحط اور جنگ جیسی آفات سے جھوجھتا رہا ہے اس صدی میں وہ نہ صرف ان پر قابو پا چکا ہے بلکہ اب اس کی دہلیز پہ عجیب سی کیفیت نے دستک دینا شروع کر دی ہے۔ فطرت معدوم ہو رہی ہے مصنوعی ذہانت [آرٹیفیشل انٹیلی جنس] اسے کنٹرول کر رہی ہے، ٹیکنالوجی اسے لحضہ بہ لحظہ یوں بدل رہی ہے کہ اسے اس کی رفتار کا ساتھ دینے کے لیے بھاگنا پڑ رہا ہے۔ نیشنل ازم جو کبھی قوموں کا نصب العین تھا آفاقیت [گلوبلائزیشن] کے سامنے بونا محسوس ہوتا ہے تشخص [آئیڈینٹٹی] کا سوال اس صدی میں اہم ہوتا جا رہا ہے، پھر مستقبل کی پیش بینی کا رجحان پروان چڑھ رہا ہے، مذہب، کلچر، سیاست معاشرتی اقدار کا جواز ڈھونڈا جا رہا ہے، اردو ادب پر جدید سماجی علوم بالخصوص نفسیات، شرق شناسی کے ساتھ سائنسی ترقی اثر پذیر ہو رہی ہے۔، تاریخ کا ماضی اور حال کی بنیاد پر مستقبل، کے متعلق پیشگوئی کا رجحان، مارکسزم، سوشل میڈیا اور ایسے ان گنت علوم ہیں جو انسانی اذہان کے ساتھ ادب پر اثر انداز ہو رہے علم کی کوئی شاخ اب خود مکتفی نہیں رہی بلکہ علوم کا ایک دوسرے پر باہمی انحصار اس کی استناد کا معیار بنتا جا رہا ہے۔ آج کا نیا مورخ محض ماضی کے واقعات یا جنگوں یا افراد کی انفرادی کاوشوں کے برعکس تاریخ کا مطالعہ نئے تناظر میں کر رہا ہے۔ جب

جب سماج نے اپنی زندگی کا چولا بدلہ ہے تاریخ کو ایک نیا موڑ ملا ہے نووال نوح ہراری بنی نوع انسان کی تاریخ پر نظر دوڑاتا ہے تو لکھتا ہے

"تقریباً ستر ہزار سال قبل ادراکی انقلاب نے تاریخ کا آغاز کیا پھر بارہ ہزار سال پہلے زرعی انقلاب سے تاریخ کو مہمیز ملی۔ سائنسی انقلاب جو محض پانچ سو سال قبل ہی شروع ہوا، ممکن ہے تاریخ کو ختم کر کے کچھ بہت مختلف شروع کر دے"(۱)

ادب کی متعینہ تعریف کے مطابق ادب زندگی کا آئینہ ہے، لیکن محض آئینہ ہی نہیں ہے اس کا نوحہ بھی ہے، محض نوحہ نہیں زندگی اور فطرت کے حسن و جمال کا ترجمان بھی ہے، کسی اجتماعی یا انفرادی تجربے کا امانت دار بھی اور کسی کسک یا کرب کا شریکِ احساس بھی۔ پھر فکشن ہے جو کسی روایت، بدشگونی، رواج، بدعت یا کسی قوم کی شناخت یا شخصی تشخص کے بطن سے جنم لیتا ہے۔ اس کا موضوع انسانی المیہ اور بدلاؤ سے درآنے والا وہ خلا ہے جو اوپر ادب کی تعریف میں متعین کردہ احساسات کو جنم دیتا ہے۔ فکشن ایک ایسی کہانی یا حکایت ہے جو فرضی ہوتے ہوئے بھی حقیقت کے قریب تر ہو۔ پھر سوال ذہنوں میں پیدا ہو گا حقیقت یا رئیلٹی کیا ہے؟ آیا حقیقت وہی ہے جو کہانی نویس کہانی کے پردے میں بتانا چاہ رہا ہے یا حقیقت کی کچھ اور جہتیں بھی ہیں جو بیک وقت کہیں اور کوئی اور قصہ یا کہانی بیان کر رہی ہیں؟ کسی دوسری تیسری جگہ کوئی اور حقیقت، کہانی کے یہ تمام روپ ایک دوسرے کے متضاد یا متصادم بھی ہو سکتے ہیں اس کے مساوی بھی۔ گویا ادب ایک ایسے حرکی نظام کار سے وابستہ ہے جو ہر رنگ میں ہر جا ہر سو رنگ بدلتا ہے یہ کہیں بھی حقیقت]طور پر نہیں اس کی جڑیں اندر بھی ہیں اور باہر بھی۔ یہ معروضی بھی ہے اور موضوعی بھی۔ ادب زندگی کی مطلق حقیقتبیان کرنے کا داعی شاید نہ ہو وہ مسلے کا حل بھی نہیں پیش کرتا وہ تو بتاتا ہے کہ زندگی کے ایک مخصوص منظر نامے میں یہ قباحتیں در آئی ہیں اب یہ قباحتیں کسی بھی سماجی سائنسی تہذیبی ادارے کی دین ہوں اس کا فریضہ اس کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ گویا ایک ایسا میکنزم ہے جو انسانی معاشرے اور نیچر یا فطرت پر چیک رکھتا ہے کہ یہاں خرابی کی صورت پیدا ہونے کو ہے۔ ادب مسلے کی سائنسی توجیہہ بھی نہیں کرتا پھر بھی یہ اہم ہے ۔

کہانی سے رغبت کا آغاز غالباً اس وقت رہا ہو گا جب چھ انسانی پرجاتیوں میں سے آخری زندہ بچ جانے والی پرجاتی (بنی نوع انسان) نے آگ اور ہتھیاروں کی تلاش کے بعد باہمی طور پر اپنی حرکات و سکنات اور کچھ آوازوں کی مدد سے گفتگو کرنا اور دن بھر کا احوال اپنے ہمزادوں کو دینا سیکھ لیا ہو گا یہ وہ مشغلہ ہو گا جس میں انسان نے پہلے پہل اپنے ہمزادوں کو کسی مخصوص مقام پر کسی خطرے یا تجربہ سے آگاہ کیا ہو گا۔ اور یہاں سے انسان نے قصہ گوئی کی طرف پہلا قدم بڑھایا ہو گا۔ اردو فکشن یا کہانی، حکایت جو کچھ بھی کہیں اپنی ہیت کے اعتبار سے اس رنگا رنگی کو پیش کرنے میں کامیاب رہا ہے یہاں میں فکشن کو بالتخصیص اردو ناول کے حوالے سے پیش کرنا چاہتی ہوں۔ ناول ایک ایسا

سفر ہے جو صحرا ہو چکی زندگی کو سیراب کرتا ہے۔ اردو ناول کو ورثہ میں جو ماضی ملا اس کی بازیافت جو کبھی اپنے پرکھوں کے کلچر کو محفوظ کرنے کے جواز کے طور پر کی گئی اب نئے ادباء کے سامنے اپنے وجود کا جواز کھو رہی ہے نئی تعبیرات پیش کرنے کی کاوش کبھی ڈھکے چھپے تو کبھی کھلم کھلا کی جارہی ہے اردو کے مایہ ناز ناول نگاروں اور نئے لکھاریوں کا ماضی اور مستقبل کا تقابلی جائزہ اس صدی کے نئے چیلنجز کی روشنی میں کرنے کی کاوش اس آرٹیکل میں کی گئی ہے۔

اس تناظر میں آج کا اردو ناول بھی بدلا ہے زرا ایک مختصر جھلک بیسویں صدی کے ناول پہ ہی ڈال لیجیے جو کبھی ماضی بعید اور ماضی قریب کی بازدید یا بازیافت کا عمل تھا اور ناول جو داستان کا ارتقایافتہ روپ ہے، آج یا اکیسویں صدی سے قبل کا ناول کم و بیش ڈیڑھ سو برسوں میں عصری مباحث کے ساتھ برصغیر میں تہذیب سماج تاریخ اور تہذیبی و ثقافتی تشخص کے گوناں گوں مباحث کو پیش کرتا چلا آرہا تھا، برطانویوی سامراج، سیاست عالمی جنگیں، ہجرت فسادات، مارشل لاء پاک بھارت جنگوں کا احوال، ساتھ ساتھ رومانویت، صنعتی معاشرے کا سماج سے ٹوٹتا رابطہ بکھرتے خاندان، فرد کی انفرادیت وجودی فلسفہ کے تحت فرد کی تنہائی عدم شناخت کا مسلہ،، جنس نگاری، غرض ان سب موضوعات کے تحت سماج میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کو بھی ناول کے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے، یہ تمامتر ناول عمومی طور پر ایک مخصوص مگر انفرادی ضخامت کے حامل رہے۔ ناول کی تنقید بھی زیادہ تر زبان و بیان، تاریخ و تہذیب، کردار کہانی پلاٹ، نفسیاتی موشگافیوں کی آئینہ دار تھی۔ ناول میں ہجرت کا کرب جس کے تحت نوسٹلجیا یا ماضی کی کرب ناک یادوں کا احوال، پرانی نسل ان کے اسلوبِ زیست سے لگاؤ نے مصنفین بالخصوص قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین، خدیجہ مستور، عبداللہ حسین اور بہت سے ناول نگاروں کو تہذیبی باز آفرینی کے ساتھ تہذیبی تاریخ کے محفوظ کرنے کی طرف مائل کیا تھا اب حال میں ادب کے ایسے مطالعے پر زور دیتا ہے جو کم سے کم وقت میں پڑھا جا سکے۔ لوگوں کے پاس اب تہذیبی مطالعے یا جزئیات کا وقت نہیں انہیں زبان کی مشکلات، سنگلاخ زمینوں یا کلاسیک روایات سے علاقہ نہیں ہے آج کا انسان سادہ، برہ راست اور عام فہم زبان و بیان کا قائل ہے اسے چارلس ڈکنز یا قرۃ لالعین حیدر کے تہذیبی رچاؤ یا فطرت کی باز آفرینی سے دلچسپی نہیں ہے ملفوف جذبات یا لفظوں کی تہہ داری کے لیے آج کے قارئین کا حوصلہ محض دو مصرعوں کے شعر تک محدود ہے۔ آج کامیاب ناول وہ ہو گا جو مختصر سادہ اور آسان ہو، کہانی کا عنصر اس کی دلچسپی کا محور ہو گا۔

آج کے پوسٹ ماڈرنزمانے میں زبان، سرحد، قومیت کی باڑ انسانیت کے لیے پیچھے رہ گئی ہے۔ قارئین کے لیے دنیا کے نوبیل ادبیات، عالمی کلاسک تک رسائی آسان ہے۔ لہذا ترجمہ کاری کا فن مقبولیت حاسل کر رہا ہے بیسٹ سیلر کتابیں اور ادب بالخصوص ناول مثلا اورحان پامک، نجیب محفوظ، ارون دھتی رائے، گبریل گارشیا مارکیز، ترگنیف، اگاتھا کرسٹی، پشکن، دستووسکی، لیو ٹالسٹائی، پیسی سدھوا اور ان گنت نام شامل ہیں جن کے ناولوں کے اردو تراجم اردو

ناول کو نئی جہات اور امکانات کی ایک دنیا سے متعارف کرانے کا رجحان لیکر آئے ہیں پھر عصری حساسیت کے ضمن میں موضوعات کے انتخاب کو اہمیت ملی ہے۔ مشرف عالم ذوقی کا ناول 'پوکے مان کی دنیا' میں جس طرح نئی نسل پر اس عہد کے جو نفسیاتی اثرات مرتب ہوئے ہیں اور جن امکانات کا اشارہ ملتا ہے وہ آج کے اردو ناول کا رجحان ہے۔

اس تناظر میں جو اردو ناول لکھا جا رہا ہے اس میں نئے زمانے کے چیلنجز جن رجحانات کو فروغ دے رہے ہیں اس میں چند ایک کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کروں گی۔ کہ یہ ناول گذشتہ ناولوں کے بالمقابل روایت سے ہٹ کر جہانِ دیگر کی خبر دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے نئی روشنی بھی ملتی ہے اردو ادب کی تاریخ میں غالباً ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر کسی منشور کے تحت ادب کی تخلیق کا جو عمل ملتا ہے وہ آج اکیسویں صدی کے ادب کے لیے مناسبت نہیں رکھتا۔ اکیسویں صدی کے چیلنجز کسی منشور کی اجازت نہیں دیتے۔ دنیا ایک ایسے کل میں سما گئی ہے کہ آج کا انسان کسی دوسرے خطے کے بسنے والے انسان کے وجود اور مسائل سے بخوبی آگاہ ہے، جمالیات کے اگر کوئی پیمانے ہیں تو وہ بہت مختلف ہیں ان تک رسائی کے لیے آج کی زندگی کی تیز رفتاری، پیچیدگی اور مسابقت کا ایسا سامنا ہے کہ کسی کو اپنے سامنے یا قریب موجود شخص کی خبر نہیں لیکن وہ سینکڑوں میل کسی دور بیٹھے شخص سے اس طور جڑا ہے کہ اس کے اندر باہر ہر بات کی خبر رکھتا ہے۔ آج کے دور میں پڑھت یا لکھت سے زیادہ اہم خود قاری ہے۔ اس کا ذوقِ جمال بس اس حد تک ہی آزاد ہے جس میں وہ بھاگ دوڑ اور بغیر مشقت کی سوشل میڈیائی تفریح سے فراغت کے چند لمحات دینے کو تیار ہوتا ہے تو اس کی نگاہ سو لفظوں کی کہانی یا چھے لفظوں کے ناول کو ڈھونڈتی ہے۔ اس وقت قارئین کی ایک بڑی تعداد فراغت کے ایسے لمحات میں کم ضخامت کے ناولوں کو ترجیح دیتی ہے۔

دوسرے ناول کی زبان و بیان، اسلوب کی گتھیوں کو سلجھانے الجھے پیچیدہ یا مقفیٰ زبان و بیان ناول کے اسلوبِ حسن کے ساتھ دماغ کھپانے کا حوصلہ بھی اس کے اندر نہیں ہے۔ ایک بار پھر گلوبل دنیا نے انگریزی زبان کی بالخصوص بالا دستی کو مستحکم کیا ہے یہ عمومی طور پر رابطے کی زبان ہے ٹرانسلیٹرز کی موجودگی نے زبان میں ابلاغ کو فوقیت دی ہے۔ ایسے ناول جن میں حد درجہ ریڈ ایبلٹی پائی جاتی ہے وہ اس وقت کیا آفاقی دنیا اور اردو ناول کے قارئین میں بالخصوص مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ دلچسپی سے بھرپور مطالعے کا عمل [ریڈ ایبلٹی] کی یہ خصوصیت تھکی ماندہ خواتین کے یہاں بالخصوص مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ ایسے ناول جو پاپولر فکشن کی ذیل میں آتے ہیں وہاں ضخامت کا سوال بھی پسپا ہوتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ پاپولر فکشن میں ناول کی صنف بالخصوص مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ آج قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، بانو قدسیہ یا طاہرہ اقبال سے زیادہ نمرہ احمد [زرد پتوں کی بہار] یا عمیرہ احمد کے قارئین کی ہے۔ اس کے باوجود کے کہ پاپولر فکشن ان فکری پہلوؤں مثلاً اکیسویں صدی کا فرد کیا سوچتا ہے کیا محسوس کرتا ہے اسے ورثہ میں جو کچھ ملا ہے وہ اس کے لیے کس قدر سود مند ہے یا کس قدر گھٹن کا باعث ہے، جیسے سوالات سے تہی

محسوس ہوتا ہے زندگی کی پہلو داری کے بالمقابل یہ فکشن سطحی یک رخا اور ذہنی تفریح یا وقتی مسائل، عصری حسیت سے دور مسابقت کی دنیا سے فرار کا راستہ دکھاتا ہے، پھر اردو ناول میں مغربی ناول کے زیر اثر جادوئی حقیقت نگاری کا ایک عنصر بھی موجود ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ ناول کے اندر اب فطرت نگاری، یا تہذیبی رکھ رکھاؤ اور ورثہ کے اظہار کے برعکس ایک ایسے بیانے کی تشکیل پر زور دیتا ہے جس کی وجہ متنوع معاشروں کا ٹیکنالوجی کے باعث باہمی ربط وضبط اور نفوذ پذیری کا عمل ہے۔ روایت یا کلاسیکیت کی جگہ ایسی جدیدیت نے لے لی ہے جس کا روایت سے رابطہ ٹوٹتا محسوس ہو رہا ہے۔ سوشل کلچرل ٹیبوز بالخصوص اس کی زد پر ہیں۔ ریاست یا خاندان کا ادارہ اب بے بس محسوس ہو رہا ہے بنے بنائے سانچوں میں دراڑیں پڑ رہی ہیں۔ آج کا مورخ خواہ کسی بھی قوم مذہب سے تعلق رکھتا ہو وہ جو بات کرے گا دنیا کا بیشتر تجربہ اس کا ساتھ دیتا محسوس ہوتا ہے۔ یووال نوح ہراری ماضی سے مستقبل کے اس سفر کے متعلق لکھتا ہے

> "ریاست اور مارکیٹ نے فرد کو ایسی آزادی دے دی جسے رد کرنا ان کے لیے خاصا دشوار تھا۔ 'منفرد بن جاؤ وہ کہتے' وہ کہتے 'اپنے والدین سے پوچھے بغیر جس سے چاہو بیاہ کرو۔ جو نوکری تمہارے لیے موزوں ہو وہ لے لو، چاہے برادری کے بزرگ اس پر منہ بنائیں ۔ جہاں چاہے رہو، خواہ اس کی وجہ سے تم ہر ہفتے خاندان کے مشترکہ اعشائیے میں شرکت سے قاصر رہ"۔ (۲)

ناول کے موضوعات اور تکنیک میں یہ تنوع آپ کو اکیسویں صدی کے بیشتر اردو ناول نگاروں کے یہاں ملتا ہے۔ موضوعات میں تنوع نئے اور سینئیر لکھاریوں ہر دو کے یہاں محسوس ہو رہا ہے لیکن ٹریٹمنٹ کا فرق ہے پرانے لکھنے والے ابھی بھی کلاسیت کو ساتھ لیکر جدت کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ مثلاً عصر حاضر کہانی کی کلاسیکل شکل کو کس طور پر زندہ رکھ رہے ہیں اس کی ایک مثال حسن منظر کا ناول العاصفہ ہے۔ حسن منظر اکیسویں صدی کا ایسا لیکھک ہے جو ناول میں فن کی اساس کہانی پر رکھتا ہے۔ لیکن متنوع معاشروں کے باہمی اختلاط کو پیش کرتا ہے وہ ناول میں ایسے کردار لاتا ہے جو ہمارے یہاں زیادہ مقبول کردار نہیں ہیں ایسے معاشرے جن کے متعلق اردو دنیا کا قاری ایک نسبتا اسٹیریو ٹائپ حساسیت رکھتا ہے۔ مثلاً عرب دنیا میں عربوں اور یہودیوں کے یہاں جو تشخص اور ارضی مسائل ہیں اس کا احوال اپنے ناول العاصفہ، بیر شیبا کی ایک لڑکی اور حبس میں پیش کرتا ہے۔ العاصفہ عرب معاشرے میں نچلے متوسط طبقے کی محرومی کی کہانی ہے اپنے موضوع اور پس منظر کے لحاظ سے یہ ایک ایسی تحریری ثبوت[ڈاکیوُمنٹری کی حیثیت رکھتا ہے جس کے مناظر میں تمام مسلم ممالک عموماً اور مشرقِ وسطیٰ کے عرب ممالک خصوصاً اپنے کردار اور معاشرتی و تہذیبی گراوٹ کے اسباب کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ عرب معاشرت کے تضادات کو بیان کرتا ہے۔ ناول کو جو

چیز سب سے زیادہ دلچسپ بنا رہی ہے وہ اس کی زبان ہے۔ ایک بدو (لیکن بہت سی زبانوں کے ماہر شخص) کی زبانی کہانی کو بیان کرتے ہوئے حسن منظر نے فنی طور پر اس مشکل کو اپنے لئے نسبتاً آسان کیا ہے جو ایک غیر ملکی زبان و کلچر کی عکاسی کے سلسلے میں انھیں پیش آسکتی تھیں۔ ناول کے اسلوب کا کمال ہے کہ ناول کو پڑھتے ہوئے جہاں یہ احساس موجود رہتا ہے کہ اس کا لوکیل غیر مقامی ہے وہاں ناول میں اسلوب کی روانی اس احساسِ اجنبیت کو دلچسپی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ حسن منظر کی فنی مہارت کی داد دینی پڑتی ہے کہ ناول میں جزئیات کی پیشکش میں کہیں بھی اس کے لوکیل کو نظر انداز نہیں کرتے جس سے ناول میں اسلوب ترجمہ اور تخلیق کے بین بین نظر آتا ہے ناول کے آغاز میں ہی مصنف زبان کے حوالے سے بڑی ذہانت کے ساتھ واضح کر دیتا ہے کہ راوی کو بہت سی زبانوں پر اس کے اصل تلفظ کے ساتھ قدرت حاصل ہے۔ لہذا جہاں عرب کلچر کی پیشکش میں وہ زبان سے مدد لیتا ہے وہاں وہ اپنے لیے آسانی کا راستہ بھی پیدا کر لیتا ہے۔ اب راوی کا جہاں دل چاہتا ہے عربی تلفظ کی پیروی میں۔

"تمام عربوں کی طرح وہ گیراج کو جیراج، اور مینگو کو مینجو کہتا اور لکھتا ہے لیکن مسجد کو مسگد بنا دیتا ہے کبھی وہ گیراج اور مسجد بھی گفتگو میں کہ جاتا ہے ۔ آلو کا بھرتا کھاتے وقت، جو اسے بہت پسند ہے وہ اسے میشڈ پٹیٹو، بھی کہہ سکتا ہے اور میشد پتے تو"(۳)

ناول میں جہاں کہیں ضروری ہوا وہاں عربی کے پورے پورے فقرے بھی دے دیے لیکن ساتھ ہی ساتھ حاشیے یا قوسین میں اس کا ترجمہ بھی لکھدیا تاکہ قاری کسی قسم کی الجھن کے بغیر بات تک پہنچ جائے اور ناول کا تاثر بھی قائم رہے۔ حسن منظر کا اسلوب منفرد اسلوب ہے۔ ان کے مزاج کا دھیما پن ان کے اسلوب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے جملے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں الفاظ نپے تلے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ ہے۔ وہ عام طور پر روزمرہ استعمال میں آنے والے الفاظ کی بجائے نئے الفاظ ڈھونڈ لیتے ہیں، مثلاً منیرہ سے زید کی آخری ملاقات ہسپتال میں ہی ہوتی ہے۔ زید بتاتا ہے۔

"میں نے پاس جا کر اس کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ان کی کھال مرجھائی ہوئی تھی ۔ جو خوشبو کا پانی میں اس کے لیے ب سے لے کر آیا تھا، اس سے اپنے رومال کو تر کر کے ہاتھ میں دے دیا اور شیشی برابر کی میز پر رکھ دی"۔ (۴)

"اس کی رنگت موتی ایسی ہے اور ہونٹ باریک۔" (۵)

"اس دن میں نے لوءلوء کو گرم ہوتے دیکھا۔ جس طرح لوہا تپائے جانے پر آہستہ آہستہ گرم ہونے لگتا ہے"۔ (۶)

"لوءلوء۔ میرے لیے آج تک اس نام میں سحر ہے"۔ (۷)

یہاں کی ہر دم حرکت میں رہنے والی ریت کی طرح کوئی چیز پیش گوئی کی تابع نہیں"۔ (۸)

"محلے کے مکانوں کے کنگر اور کوٹھے چاندنی میں صم بکم کھڑے تھے"۔ (۹)

"بیٹا دوستوں کو نئی ماں دکھا رہا تھا"۔ (۱۰)

"جیسے سانپ کی دل کو لبھانے والی خوبصورتی کو دیکھ کر گھٹنیوں چلنے والا بچہ اس کی طرف چل پڑیا ور کلکاریاں مارے" (۱۱)

بیر شیاب کی ایک لڑکی اور 'حبس' اس عالمگیرت کا اظہار ہے جہاں سنی سنائی باتوں کے بالمقابل ایک ایسا بیانیہ ہے جو دکھ والم، یاس کی ایک ایسی کتھن ہے جہاں سوشل نارمز اور سیاسی عزائم خود بنی نوع انسان کے لیے عجیب و غریب کشمکش کا اعلامیہ ہیں۔ بیر شیبا کی ایک لڑکی ایک ایسی چالیس سالہ بغیر کشش رکھنے والی عورت کو بیان کرتا ہے جس نے اپنے والدین کو گیس چیمبر کی طرف جاتے دیکھا اور جو آخری بار کا مڑ کر دیکھنا ہوتا ہے اپنی زندگی کے بجھتے چراغ کے سامنے اولاد کو ترسی نگاہ سے دیکھنا اس سے گریز کرتے والدین، جس نے ۱۹۳۹ء کی جنگ میں پولینڈ میں نازیوں کے ہاتھوں اپنے والدین کو موت کی طرف چل کر جاتے دیکھا تھا رابیکا اور اس کے والدین کو ائیر پورٹ پر روک لیا گیا تھا اور جب وہ اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے ایک کر سچین فیملی نے رابیکا کو موت کے منہ میں لے جائے جانے سے بچا لیا تھا جب وہ صرف ۴۱ برس کی تھی۔ اور بے میل کا خون رکھنے کا یہودی نظریہ اکیسویں صدی کے اس معاشرے میں اپنے ہی پیروکاروں کو کونسے نفسیاتی مسائل دے رہا ہے ناول میں اس کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔ ناول کی ضخامت کم، بیانیہ سادہ شگفتہ اور ہائی ریڈ ایبلٹی کا حامل ہے۔

"دونوں گہری سانس لیکر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ غیر عورت میرا ہاتھ تھامے رہی اور اس کا]کے ؟[شوہر کا ہاتھ خود اس کے دور کے کندھے پر تھا۔ میں نے اپنے پنجے اور ایڑیاں جیسے کنکریٹ کے فرش میں دھنسا رکھے تھے اور میرے جبڑے اتنی سختی سے بند تھے کہ ان میں درد ہونے لگا۔ پھر بھی میں اس صدمے سے اندر ہی اندر ہل رہی تھی اور میری آنکھیں خشک تھیں۔ میرے ماں، باپ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے مجھ سے دور ہوتے گئے لیکن انھوں نے میرے لیے جو سب سے بڑی قربانی دی وہ یہ تھی کہ ایک بار بھی پلٹ کر انھوں نے مجھے نہیں دیکھا"۔ (۱۲)

اور یہ ہی وہ نقطہ جس نے رابیکا کی شخصیت میں ایک خلا پیدا کر دیا۔ اس نقطہ پر اس کی زندگی رک گئی جب اس کے والدین بغیر اس کی طرف پلٹ کر دیکھے آگے بڑھ گئے۔ اس احساس نے کہ اس کی زندگی کا یہ حادثہ اس وجہ سے پیش آیا کیونکہ وہ یہودی النسل تھے اس نے رابیکا کو اپنی شناخت کی بقا کی طرف مائل کیا۔ لہذا اپنے نئے والدین کے

گھر میں وہ خود کو کر سچین اعتقادات سے دور رکھنے کی سعی کرتی رہی۔ اور اپنے مذہبی عقیدے کو والدین کی قربانی کے بدلے راسخ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ یہودیوں کا ایک عقیدہ ہے کہ یہ خون کے تسلسل پر یقین رکھتے ہیں،

"میرے دوسرے ملنے والے خود کو اسرائیلی بتاتے تھے۔ اور اس کے دعوے دار تھے کہ ان کا خون بے میل تھا۔ یعنی نسل کے جاری رکھنے میں ان کے پرکھوں میں سے کسی نے گڑبڑ نہیں کی تھی۔ سب حضرت نوح کی کشتی میں سے اترنے والوں میں سے تھے.....اور ان میں سے کسی کا ارادہ آنے والی نسل کو بے میل رکھنے کے ۳۱ لیے کسی قسم کی گڑبڑ کا نہیں تھا۔"(۱۳)

رابیکا جو اس زندگی کے بوجھ تلے دبی ہے۔ جو اس کے حقیقی اور غیر حقیقی والدین کی قربانیوں اور احسانوں کے نتیجہ میں اسے ملتی ہے۔ اور یہ احساس اسے اپنے واحد بچ جانے والے مذہب کے رشتہ سے مضبوطی سے چمٹ جانے پر اکساتا ہے تو دوسری طرف اسے اپنے نئے والدین سے اپنی اندرونی کشمکش چھپانے کا حوصلہ بھی عطا کرتا ہے۔ لیکن اس کی زندگی اس وقت اور بھی زیادہ انتشار کا شکار ہو جاتی ہے جب اس کی زندگی میں مرد داخل ہوتا ہے۔ وہ جو اپنے والدین کی محبت اور قربانیوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے ابعد (ضمیر) مذہب کی بھی مجرم بن جاتی ہے

"میری زندگی ان کے نزدیک بڑی قیمتی ہو گی جس کی حفاظت وہ آخری دم تک کرنا چاہتے ہوں گے"۔(۱۴)

رابیکا کے اندر کی عورت جو اس بچے کی شکل میں اپنی تکمیل کے انتظار میں تھی اپنے ملک واپس چلی جاتی ہے اور ایک کالے بچے کو جنم دیتی ہے جس کا نام وہ ڈیوڈ رکھتی ہے۔ اب وہ دہرے عذاب میں گرفتار ہے۔ رابیکا اپنے ضمیر کی اس آواز سے تنگ ہے۔ جو ایک یہودی عورت کے اپنے خون کو میلا کرنے سے پیدا ہوئی ہے۔ کیونکہ اب خالص خون کا تسلسل نہیں رہا۔ وہ چھوٹے ڈیوڈ کے ان سوالات سے بھی پریشان ہے جو وہ اپنے رنگ اور باپ کے متعلق کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح ان کا اگلا ناول حب(۱۵) ہے جو اسی معاشرت سے اٹھتے بدبو کے بھبکے بھی پیش کرتا ہے۔ کہ اسرائیلی وزیر یا عظم ایریل شیرون جو ایرک عرف 'بلڈوزر' کے نام سے دوستوں میں پہچانا جاتا ہے جبکہ اسرائیلی وزیرِ اعظم ڈیوڈ بین گوریوں نے اس کی فلسطینی عربوں کے خلاف سفاک جارحیت پر "شیرون" کا خطاب دیا تھا۔ اس کی داخلی خود کلامی پر مبنی ناول ہے شیرون حسن منظر ناول کے اس مرکزی کردار سے دیگر کرداروں کی شکل میں ہمکلام ہیں شیرون اس وقت جب وہ اسرائیل کا وزیر اعظم تھا دماغ کی شریان پھٹ جانے کے باعث کوما میں چلا گیا جہاں اگلے آٹھ سال وہ تل عفیف کے بیر شیبا ہسپتال میں زیرِ نگہداشت رہا۔

شیرون کی مشکل یہ ہے کہ وہ تضادات کی زد میں ہے جسے جھٹلانا اس کے بس میں نہیں ہے۔ ایک طرف وہ اسرائیل کا ایسا سپوت ہے جس کی اس ملک سے جسے عظیم زائیون بننا ہے وابستگی غیر مشروط اور مذہبی فریضہ کے مماثل ہے۔ وہیں وہ اپنی سیاسی پارٹی آمرانہ مزاج اور طاقت کی بدولت اپنی ہی کنیسٹ میں "سویا ہوا دیو sleeping' giant] کہلاتا ہے۔ جسے ان مظلوم آوازوں کا بھی سامنا ہے جن کا استحصال] قتل[اس نے اپنے ہاتھوں سے کیا تھا تو دوسری طرف خود اس کے اپنے لوگوں کی آوازیں جو اس دنیا سے چلے گئے ہیں لیکن وہ ناول میں اپنی چھب دکھلاتے ہیں۔ اسپتال کے کمرے کی دیوار بصری پردے کا کام کر رہی ہے۔ جہاں اسے اس کے ظلم و بربریت کی تصویریں لگاتار دکھائی جاتی ہیں اور اسکی مشکل یہ ہے کہ اسے ان آوازوں کا سامنا ہے جنہیں وہ خاموش نہیں کرا سکتا ہے نہ کان کے پردوں سے نہ تاریخ کے پنوں سے۔ جن کے سوالات تلخ تر ہوتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ ان سوالات کو خاموش کراتے کراتے ہوئے وہ ذہن جو سفاکی میں اپنی مثال آپ تھا اب نظریاتی سطح پر خود بھی شکوک کا شکار ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناول گردشِ رنگ چمن اور آگ کا دریا میں جو تہذیبی تسلسل بیان کیا گیا ہے اس میں ایک یوریشن طبقہ اور اس کی پیتا کا احوال اہم ہے لیکن علی اکبر ناطق کا ناول آسان سادہ اور براہ راست طور پر پنجاب کے خطہ سے محبت کرنے والے ایک انگریز ولیم کا احوال پیش کیا ہے جو ایک طرف ملٹی کلچرل معاشرے کی خبر دیتا ہے دوسرے اسٹیر ٹائپ کی بجائے کہ انگریز اس خطہ میں صرف لوٹ مار کرنے آئے تھے اس کی بجائے ایک انسان دوست اور اس کلچر اور خطہ سے محبت کے دعویدار کردار کو پیش کیا گیا ہے جبکہ اس عہد میں اہم مسلم رہنماؤں کے طرز عمل کا ایک ایسا بیانیہ بھی ہے جو پولیٹیکل ٹیبوز کے ضمرے میں آتا ہے۔

اکیسویں صدی میں گلوبل کلچر کی پیشکش کا رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ فاصلوں کے کم ہونے اور سوشل میڈیائی رابطوں اور قربتوں نے ٹوئیٹم بلاگز فیس بک پوسٹس اور واٹسایپ جیسی سہولیات کو جنمدیا ہے۔ جہاں اختصار اور جامعیت کی طرف معاشرہ بڑھا ہے وہاں قارئین کے یہاں مختصر تحریروں کو فروغ ملا ہے اسی طرح ایک وقت تھا جب پرائے دیس کو جانے والے اپنی تنہائی، اجنبیت اور بے ثباتی کو پیش کرتے تھے ادب میں ہجرت کا تجربہ ہمیشہ تخلیقی سطح پر بڑا بارآور، اور زرخیز رہا ہے۔ اور عموماً دورِ حاضر کے مقابلے میں ماضی میں اس کے ساتھ المیہ کو وابستہ کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن آج کے دور کی بڑھتی ہوئی مادیت پرستی نے جس طرح بشر کے لیے معنوی سطح پر اشیاء کے مفہوم کو بدلنا شروع کیا ہے۔ بعینہ انسان کی شعوری جذباتی وابستگیوں، دل بستگیوں کے مفہوم میں بھی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ آج جلاوطنی کے انسانی نفسیات پر جو اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ وہ ماضی میں نسبتاً کس قدر گہرے دور رس اور نفسیاتی تھے۔۔ انسان اپنے وطن کی سرزمین کو ماں یا ماتا کا رتبہ دے کر دھرتی یا جنم بھومی سے جڑا رہا یا رہنا پسند کرتا رہا۔ اور اپنے گردو پیش سے وابستہ مناظر و مظاہرِ حیات سے جذباتی وابستگی اس کی گھٹی میں شامل رہی ہے۔ یہ بھی ایک دل چسپ

حقیقت ہے کہ الہامی مذاہب کے پیروکاروں کے ہاں ہی ارضی لگاؤ کا شدید جذبہ بشری کمزوری کے طور پر سامنے آتا رہا ہے۔ لیکن جدید دور کی سائنسی اور مادی ترقی کی دوڑ نے انسان کی اس کمزوری کو بھی ایک اور ہی جہت سے روشناس کرا دیا ہے۔ جہاں اخلاق، مذہب، اعلیٰ انسانی اقدار، اوصاف وصفات بھی پانی بھرتے نظر آرہے ہیں۔ اور وہ جہت مادیت پرستی ہے، دورِ حاضر کی روحِ عصر مادیت کی مظہر ہے۔ خصوصاً نو آبادیات کی زندگی کی تمام تر تگ و دو کا محور و مرکز [کارپوریٹ نظام کی عطا] مادیت پرستی ہے۔ جب زندگی کا مطمحِ نظر یہ یہی ہو تو نو آزاد اقوام مابعد نو آبادیات میں پھنسنے یا جکڑے جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔

مابعد نو آبادیاتی نظام میں مادیت پرستی کا یہ رویہ نہ صرف فرد کی کایا کلپ (ٹرانس فارمیشن) کا باعث بن رہا ہے۔ بلکہ حیات کی وہ اہم اسے ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ فرد پہلے سے زیادہ اکیلا اور مادی خواہشات کے حصول کی مشین بنتا جا رہا ہے۔ یہ عجیب تضاد ہے جوں جوں دنیا گلوبل ویلج بنتی جا رہی ہے فرد کے احساسِ تنہائی کو مقابلتاً گہرا کرتی جا رہی ہے۔۔ بلکہ اس سے کلچر اور زبان میں بھی تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی مسلسل تبدیلی کی زد میں ہے۔ اس مادی تگ و دو میں بشر نے اپنی فطری کمزوری، اپنی شناخت کا بنیادی حوالہ وطن یا ارضیت و سماجیت سے دستبرداری کو بھی قبول کر لیا ہے۔ آج کا انسان خصوصاً تیسری دنیا کے ممالک وطنیت کے اس روایتی تصورات سے آہستہ آہستہ آزاد ہو رہے ہیں۔ اور (نو آبادیاتی نظام کی جدید شکل) مابعد نو آبادیاتی نظام میں خود کو ضم کر رہے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے یہاں بالخصوص یہ عنصر ان کے اولین ناولوں مثلاً دیس ہوئے پردیس، غزالِ شب، راکھ، خس و خاشاک زمانوں میں دیکھنے کو ملتا ہے لیکن ان کے ہی ایک ہم عصر سینئیر لکھاری عبداللہ حسین کے یہاں ڈائیاسپورک ادب میں ایک نئی جہت پیدا ہوئی کہ اب دیس بدیس کچھ نہیں انسان نے جہاں اپنی جڑیں جما لیں وہی اس کا دیس ہے۔ عبداللہ حسین کے یہاں ہجرت نے مابعد نو آبادیاتی دنیا میں بیرون ملک مقیم لوگوں کی مصائب اور مشکلات سے جنم لیا ہے۔ عبداللہ حسین کے کردار یا تارک وطن، دیارِ غیر میں خود ساختہ جلاوطنی اختیار کیے ہوئے ہیں ان کی زندگی کا نصب العین اپنے پیچھے چھوڑ آنے والے افرادِ خانہ کی بہتر زندگی اور مادی لحاظ سے خوشحالی کا حصول ہے۔ لہٰذا رضیہ فصیح احمد کے یہاں تارکین وطن کے مسائل کو اگلی نسل میں مشاہدہ کرنے کا رجحان ملتا ہے۔

مرزا اطہر بیگ فلسفے کے استاد اور گورنمنٹ کالج لاہور میں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے۔ ان کا پہلا ناول "غلام باغ" ۲۰۰۶ میں منظر عام پر آیا، اس کے بعد ان کا ناول "صفر سے ایک تک"، اور ۲۰۱۴ء میں "ان کا ناول حسن کی صورتِ حال خالی جگہیں پر کرو" شائع ہوا، ان کے یہ تینوں ناول گھمبیر قسم کے فلسفیانہ، سماجی، معاشرتی، طبقاتی اور نفسیاتی سوالات سموئے ہیں ان کے ناولوں میں عالمی صورتِ حال کا بھی ان کے ناولوں میں اظہار رہوا ہے۔ غلام باغ 'ارزل نسلوں' کی سماجی و تہذیبی تاریخ کا احاطہ کرتا ہے یہ یہ ارزل نسلیں یا جنہیں دلت طبقات، مانگر

جاتی کہیں۔ معاشرے اور سماج کے دھتکارے ہوئے لوگ ہیں مانگر جاتی سے تعلق رکھنے والے ایک ڈاکیے خادم حسین ڈاکیے کو عمر بھر دھتکار کے بعد ایک ایسا رجسٹر ہاتھ لگتا ہے جسے وہ مرنے سے پہلے اپنے بیٹے یاور حسین کو سونپ دیتا ہے یہاں سے یاور حسین کو اس ازلی دھتکار، اور صدیوں کی بے توقیری سے نجات پانے کا راستہ ملتا ہے۔ معاشرے کا مقتدر طبقہ اس کی چوکھٹ پر آبیٹھتا ہے اپنے تمام تر تفاخر کے ساتھ کہ اس طبقاتی معاشرے میں کوئی بامقصد طرزِ حیات نہیں ہے جہاں جنسی قوت حاصل کرنے کے اشتہار ملک بھر کی دیواروں پر نظر آتے ہوں وہاں یاور حیات کی چوکھٹ پر کیسے کیسے سر نہ جھکتے ہوں گے۔ غلام باغ ایک آثار قدیمہ ہے۔ جہاں دفینہ کی موجودگی بھی امکانات میں شامل ہے۔ اس کا زمانہ مابعد نو آبادیاتی عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ نو آبادیاتی عہد کے اثرات جو حال میں ذلت اور شکست کی متنوع صورتوں کو بالآخر جنون کی سطح پر لے گئے ہیں کہ دور غلامی سے نکل کر اس عہد کا انسان اب نفس کا غلام بن چکا۔ اس حوالے سے خود مصنف نے ایک انٹرویو میں کہا ہے۔ دیکھتے ہیں:

"غلام باغ کا ایک بڑا موضوع انسان کی انسان پر، قوموں کی قوموں پر اور نسلوں کی نسلوں پر غلبہ پانے کی خواہش ہے۔ غلبے کی بات ہو گی تو موضوع بنیں گے"۔ (۱۶)

[مستنصر حسین تارڑ خس و خاشاک زمانے مستنصر کا سب سے ضخیم، دلچسپ اور متنوع جہات ناول جو تین نسلوں کے تاریخی، تہذیبی، سماجی، مذہبی تناظرات کی پیشکش کرتا ہے ۷۴۰ صفحات پر مشتمل اس ناول میں مستنصر کی آٹو بائیو گرافیکل جھلکیاں بھی موجود ہی ہے۔ ۲۰۱۰ء میں یہ ناول سنگِ میل پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ یہ ناول ۱۹۲۹ سے ۲۰۰۱ کے عرصہ پر محیط ہے۔ بالخصوص پاکستان کے قیام کے بعد مابعد نو آبادیاتی چیلنجز جن میں مادیت پرستی، کرپشن، فوجی آمریت، سیاسی عدم استحکام اور شخصی انداز حکمرانی، غریبوں کا استحصال اور غریب اور امیر کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج، اور لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی دنیا، تاریخ اور تاریخی قوتوں کی تعبیرِ نو، اور جدید دنیا سے جنم لیتے کثیر الثقافتی کلچر کی ناگزیریت جیسے موضوعات کو پیش کرنے والوں کی صف میں تارڑ سب سے پیش پیش ہیں

"سروسانسی کو معاشرے کے دوسرے ذیل طبقوں پر بھی اس معاملے میں فوقیت حاصل تھی کیونکہ وہ تو اُن سے بھی کہیں نچلی سطح پر زندگی گذارتا تھا۔۔۔ یوں وہ انسانی فطرت اور خصلت کا ایک باکمال پارکھ تھا ۔۔۔ مردم شناس تھا"۔ (۱۷)

"سانسیوں، گگڑوں اور تپڑواسیوں نے بھی اُس اتھل پتھل سے فائدہ اٹھایا تھا جو ہر سُو ذات پات دین دھرم، تاریخی اور خاندانی اقدار کو چاٹ رہی تھی۔۔۔ جو رذیل تھے وہ اشراف میں بدل رہے تھے جب کہ اشرف ذلیل ہو رہے تھے۔۔ ۔ ذات پات اور دین

دھرم ہمیشہ مٹی کے ساتھ ہزاروں برسوں کی قربت سے ہی مستحکم رہتے ہیں۔۔۔ اُس مٹی میں جو بھی دفن ہوتا ہے یا اُس کے ساتھ مٹی ہو جاتا ہے"[۱۸]

تراجم میں جس چیز نے فروغ پایا وہ ادب میں اس جنس کی نمایندگی تھی جھنیں آفاقی سطح پر ہی رذیل بھی شمار کیا گیا، اپنے رنگ نسل کی بنا پر سفید فام اقوام کی کالونی بھی رہے اور بالآخر اس صدی میں ان کے لیے آوازیں اُٹھنا شروع ہوءیں کہیں انھوں نے خود اپنے حقوق کی آواز بلند کی جیسے کہ دلت طبقات نے خود کو انڈیا میں اپنی تحریروں سے متعارف کروایا، یڈورڈ سعید نے تو خیر اسے دانشورانہ سطح پر اجاگر کیا لیکن ارون دھتی راءے کا ناول شادمانی کی مملک، بپسی سدھو کا جنگل والا صاحب، مقبول ترین ناول دی روٹس کا ترجمہ اساس کے نام پر ہوا، اسی طرح ایک اور بہت اہم ناول وحشیوں کا انتظار، یا پھر خانہ معصومیت، دوز خانامہ،، امین مالوف کا سمر قند، شہر اطمینان سرخ میر انام ایسے ناول ہیں جن کے تراجم اردو دنیا میں ناول کا کا فن او موضوع، تکنیک اور رتحلیقیت کی متنوع جہات سے متعارف کرواتے۔

حوالہ جات

۱۔ یووال نوح ہراری، بنی نوع انسان کی مختصر تاریخ ترجمہ: عقیل عباس سومرو، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۱۹ء، ص،۲

۲۔ یووال نوح ہراری، بنی نوع انسان کی مختصر تاریخ، مترجم عقیل عباس سومرو، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۱۹، ص۳۸۵

۳۔ حسن منظر، ڈاکٹر، العاصفہ، شہر زاد پبلشر کراچی، ص۵

۴۔ ایضاً ص۱۷۰

۵۔ ایضاً ص۱۱

۶۔ ایضاً ص۱۲

۷۔ ایضاً، ص۱۱

۸۔ ایضاً ص۲۳

۹۔ ایضاً ص۳۱

۱۰۔ ایضاً ص۸۴

۱۱۔ ایضاً ص۸۸

۱۲۔ حسن منظر، ڈاکٹر، دو مختصر ناول، شہر زاد پبلشر کراچی، ۲۰۱۰ء، ص۳۶

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ایضاً ص۵۳

۱۵۔ حسن منظر، ڈاکٹر، حبس، شہر زاد پبلشر زکراچی، ۲۰۱۶ء

۱۶۔ خالد اشرف ڈاکٹر، برِ صغیر میں اردو ناول، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۰۵ء ص نمبر ۲۷۸
۱۷۔ خس و خاشاک زمانے، ص نمبر "۲۸۱
۱۸۔ خس و خاشاک زمانے، مستنصر حسین تارڑ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰۲، ص نمبر ۳۴۸

References in Roman Script

1. Youval Noh harari, bani nau insane ki muKtasir tareekh [Sapiens: A Brief History Of HUMANKIND],translator Aqeel Abbas Somro, fiction house Lahore,2019,page No 12.
2. Youval Noh harari, aizan, page No.385
3. Hasn manzar, Dr, Alasifa, Scherhr Zade publuishers Karachi, 2006, page No.5
4. Hasn Manzar, Dr, Alasifa, aizan, page No 170
5. Aizan, page No.11
6. Aizan, page No.12
7. Aizan, page No.11
8. Aizan, page No.23
9. Aizan, page No.31
10. Aizan, page No.84
11. Aizan, page No.88
12. Hasn Manzar, Dr, du Mukhtasir Novel, Scherhr Zade publuishers Karachi, 2010, page No36
13. Aizan, page No. 36
14. Aizan, page No. 53
15. Hasn Manzar, Dr. Habas, Scherhr Zade publuishers Karachi, 2010
16. Khalid Ashraf Dr. Bar e sagheer main Urdu novel, Fiction House Lahore 2005, page No.278
17. Tarar, Mustansir Hussain, Khas o khashak Zamnay, Sang e meel publications Lahore 2010, page No.182
18. Aizan, page No.384